مشفق خواجہ کے ادبی کالموں کی تحقیق میں اہمیت

ڈاکٹر عامر سہیل*

طارق کلیم**

Abstract:

Mushfiq Khwaja is a well known researcher but he is also famous for his literary columns. These columns were published in daily "Jasarat" Karachi, weekly "Zindgi" Lahore and weekly "Takbeer" Karachi during the 7th, 8th and 9th decade of last century. These columns posses precious information about writers and their literary work. These columns can be very useful for the students of literature in the domain of research. In this article importance of these columns are described briefly.

مشفق خواجہ کا اصل نام خواجہ عبدالحئ تھا وہ ۱۹/ دسمبر ۱۹۳۵ء کو لاہور کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے (۱) مشفق خواجہ نے ابتدائی تعلیم لاہور ہی میں حاصل کی تاہم قیام پاکستان کے بعد ان کا خاندان کراچی منتقل ہو گیا۔ یہاں انھوں نے پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے میٹرک کیا۔ ۱۹۵۴ء میں اسلامیہ کالج کراچی سے ایف اے کیا (۲) ۱۹۵۷ء میں کراچی یونیورسٹی سے بی اے آنرز اور ۱۹۵۸ء میں میں ایم اے اردو کیا (۳) اس کے بعد مولوی عبدالحق نے مشفق خواجہ کو انجمن ترقی اردو کے عملے میں شامل کر کے ناموس الکتب کا مدیر مقرر کر دیا (۴) تاہم اس سے پہلے وہ رضا کار کے طور پر انجمن ترقی اردو میں کام کرتے رہے اور ایم اے اردو کرنے سے پہلے ہی وہ ماہ نامہ ''قومی زبان'' اور سہ ماہی ''اردو'' کی ادارت کی ذمہ داریاں نبھانے لگے۔ (۵) ان کے تحقیقی اور تدوینی کاموں میں سعادت خان ناصر کا تذکرہ ''خوش معرکہ زیبا'' (تدوین) ''پرانے شاعر نیا کلام'' (تحقیق)، ''اقبال از احمد دین'' (تحقیق)، ''جائزہ مخطوطات اردو'' (تحقیق)، ''غالب اور صفیر بلگرامی'' (تحقیق)، ''تحقیق نامہ'' (تحقیق) اور ''کلیات یگانہ'' (تدوین) شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی شاعری کی ایک کتاب ''ابیات'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ مشفق خواجہ کا انتقال ۲۱/ فروری ۲۰۰۵ء کو ہوا اور انھیں کراچی میں سوسائٹی کے قبرستان میں دفن کیا گیا (۶)

---

* صدر شعبہ اُردو، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا

** شعبہ اُردو، گورنمنٹ ڈگری کالج، کوٹ مومن

مشفق خواجہ بلند پایہ محقق تھے تاہم انھیں عوامی شہرت ادبی کالموں کے ذریعے ملی جو بیسویں صدی کی ساتویں، آٹھویں اور نویں دہائی میں روزنامہ ''جسارت'' کراچی ہفت روزہ ''زندگی'' لاہور اور ہفت روزہ ''تکبیر'' کراچی میں شائع ہوتے رہے۔ وہ یہ کالم ہفت روزہ ''زندگی'' لاہور میں خامہ بدوش کے قلمی نام سے لکھتے اور کالم کا مستقل عنوان ''ورق ناخواندہ'' تھا۔ روزنامہ ''جسارت'' کراچی اور ہفت روزہ ''تکبیر'' کراچی میں ان کے کالم کا مستقل عنوان ''سخن در سخن'' تھا اور یہاں انھوں نے اپنے لیے قلمی نام ''خامہ بگوش'' پسند کیا۔

مشفق خواجہ نے اپنی کالم نگاری کا آغاز روزنامہ ''جسارت'' کراچی سے ۲۵ مئی ۱۹۷۰ء کو کیا۔ وہ غریبِ شہر کے قلمی نام سے سماجی اور سیاسی موضوعات پر کالم لکھا کرتے تھے تاہم کبھی کبھار وہ ادب اور ادیبوں کو موضوع بنا کر بھی خامہ فرسائی کرتے۔ انھوں نے باقاعدہ ادبی کالم نگاری کا آغاز ہفت روزہ ''زندگی'' لاہور سے کیا۔ ان کا پہلا ادبی کالم ۱۴ر فروری ۱۹۷۱ء کو شائع ہوا۔ اس کے بعد وہ وقفے وقفے سے روزنامہ ''جسارت'' کراچی اور ہفت روزہ ''تکبیر'' کراچی میں ادبی کالم لکھتے رہے۔ ان کا آخری کالم ۲۲ مارچ ۱۹۹۷ء کو ہفت روزہ ''تکبیر'' کراچی میں شائع ہوا۔ مشفق خواجہ کے کالموں کے اب تک ۸ مجموعے شائع ہو چکے ہیں جو سب کے سب ہفت روزہ ''تکبیر'' کراچی میں شائع ہونے والے کالموں پر مشتمل ہیں۔ مشفق خواجہ کے یہ کالم اس دور میں بہت مقبول تھے اور بقول خلیق انجم ''خامہ بگوش نے جس ہندوستانی شاعر کے مجموعہ کلام پر تبصرہ کیا اسے ساہتیہ اکیڈمی انعام مل گیا''(۷) ان کے یہ کالم موضوع کے اعتبار سے ادبی اور اسلوب کے لحاظ سے فکاہیہ کالموں کے زمرے میں آتے ہیں۔ ان کالموں میں طنز و مزاح کی چاشنی تو تھی ہی تاہم ان سے قاری کو ادب اور ادیبوں کے بارے میں بہت سی نادر معلومات بھی مل جاتیں جو ان کے علم میں اضافے کا باعث بنتیں۔ تحقیقی زاویہ نظر سے ان کالموں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کالم تحقیق کرنے والوں کے لیے بہت سا ابتدائی مواد مہیا کر دیتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ یہ معلومات بڑے محققین کے لیے تو دل چسپی کا باعث نہ ہوں البتہ ادب کے سنجیدہ قاری اور طالب علم ان سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔

تحقیق میں ان کالموں کی اہمیت دو وجوہات کی بنیاد پر ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ یہ تین دہائیوں پر مشتمل ادبی صورت حال کی دستاویز ہیں۔ بیسویں صدی کی آخری تین دہائیوں کی ادبی صورت حال پر اگر کوئی تحقیق کرے تو وہ مشفق خواجہ کے ان کالموں سے ضرور استفادہ کرنا چاہیے۔ یہاں اسے اپنی تحقیق کے لیے بہت سا ابتدائی مواد مل جائے گا۔ دوسرے اس لیے کہ ان کالموں میں ایسی تاریخی معلومات مل جاتی ہیں جو ادب کے طالب علم کے لیے بہت دل چسپی کا باعث ہوتی ہیں۔ ماضی کے بہت سے ایسے اہم کردار جو فراموش ہو چکے ہیں، ایسی کتب جو اب دست یاب نہیں، اور معاصر ادیبوں کے بارے میں وہ معلومات جو عام طور پر منظر عام پر نہیں آتیں ان کا ذکر ان کالموں میں جا بجا ملتا ہے جو تحقیق کرنے والوں کے لیے دل چسپی کا باعث ہوتی ہیں۔ خواجہ محمد ذکریا مشفق خواجہ کا کالموں کے کی اس خصوصیت کو یوں بیان کرتے ہیں۔

مشفق خواجہ کے کالموں اور خطوط کی اہمیت اس لیے بھی بہت زیادہ ہے کہ ان کے

ذریعے تحقیق کرنے والوں کو بہت سا ابتدائی مواد مل جاتا ہے۔(۸)

ڈاکٹر سلیم اختر کہتے ہیں

> تاہم یہ نہ سمجھئے کہ کالم صرف فقرے بازی تک محدود تھے۔ ایسا نہیں ہے ان کی تحقیقی معلومات ادبی شخصیات کے بارے میں ٹھوس اطلاعات اور حقائق فراہم کرتی ہیں۔(۹)

ڈاکٹر ممتاز احمد خان مشفق خواجہ کے کالموں کی اس خوبی کے بارے میں رقم طراز ہیں۔

> مشفق خواجہ گوشہ نشین تھے مگر تمام ادبی حلقوں تک ان کی پہنچ تھی وہ جانتے تھے کہ کوئی کہاں کیا کر رہا ہے، وہ ادبا، شعرا، ناقدین اور محققین کی نفسیات سے خوب خوب واقفیت رکھتے تھے۔ ان کی یہ صلاحیت ان کے کالم ''خامہ بگوش کے قلم سے'' میں بہت کام آئی اس کالم کے مندرجات سے بھی ادبی شخصیات کا زائچہ مرتب ہوسکتا ہے۔(۱۰)

مشفق خواجہ کا کوئی ادبی کالم ایسا نہیں ہے جو ادبی معلومات سے خالی ہو۔ وہ یہ معلومات بہت سلیس اور سہل زبان میں فراہم کرتے۔ تحقیق کی اصطلاحات پر ہیز کرتے۔ اس طرح یہ معلومات عام قاری کے لیے بھی دل چسپی کا باعث بن جاتیں۔ اس ضمن میں چند نمونے درج ذیل ہیں۔

سعادت یار خاں رنگین کا نام کس نے نہیں سنا ہوگا۔ یہ شاعر جس نے انشا اللہ خان انشا کی وفات کے بعد ریختی میں نام پیدا کیا اور اس قسم کے شعر کہہ کر عوام کے دلوں، ادب اور تاریخ میں اپنے لیے جگہ بنالی۔

جو بات ہونی تھی وہ بات ہوئی کہارو چلو لے چلو میری ڈولی کہارو
ذرا گھر کو رنگین کے تحقیق کرلو یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو

ان سعادت یار خان رنگین کی وفات کے تقریباً نوے برس کے بعد ان کے خاندان میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ جس نے اپنے جد امجد کی طرح ادبی دنیا میں بڑا نام پیدا کیا۔ فرق یہ ہے کہ رنگین ریختی کے استاد تھے اور یہ استاد ریختہ کے منصب پر فائز ہوا۔ والدین نے اس کا جو نام رکھا تھا اس میں تخلص کا اضافہ اس عزیز نے خود کرلیا اور چودہ برس کی عمر میں جب وہ احسان دانش کے حلقہ شاگردان میں شامل ہوا تو اس نے اپنا تعارف سید محمد انور نرگس بخاری کی حیثیت سے کروایا۔ احسان دانش نے کہا کہ ''بھلا نرگس بھی کسی مرد کا تخلص ہوتا ہے'' یوسف ظفر کی تجویز پر نیا تخلص منتخب کیا گیا اور پھر یہ شاعر آگے چل کر شہرت بخاری کے نام سے مشہور ہوا۔(۱۱)

اس اقتباس کا جائزہ لینے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ مشفق خواجہ نے بہت کم الفاظ میں شہرت بخاری کے بارے میں بہت سی معلومات فراہم کر دی ہیں اور تحریر کی ادبی شان بھی برقرار ہے اور تحقیق سے جو یک رنگی منسوب ہے وہ اس میں کہیں نظر نہیں آتی۔ اسی طرح ماضی کے دو لکھنے والوں کو تعارف یوں کرواتے ہیں۔

ادیبوں کی نئی نسل محمد عمر نور الہٰی کے نام سے کا ہے کو واقف ہوگی کہ وہ سوائے اپنے نام کے کسی اور کا نام سنا

پسند نہیں کرتی۔ وہ لوگ جو قیام پاکستان سے پہلے کی کتابیں اور رسالے پڑھتے رہے ہیں وہ محمد عمر نور الٰہی سے خوب اچھی طرح واقف ہیں۔ رسالوں میں بے شمار مضامین اس نام سے چھپتے رہے ہیں ایک درجن کے قریب ڈراموں کے تراجم بھی کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اردو ڈرامے کی تاریخ ''ناٹک ساگر'' بھی محمد عمر نور الٰہی کی تصنیف ہے۔ عموماً لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک ہی فرد کا نام ہے لیکن اس ایک نام کے پردے میں دو دوست چھپے ہوئے تھے ایک کا نام محمد عمر تھا اور دوسرے کا نور الٰہی یہ دونوں اس حد تک یک جان دو قالب تھے کہ فرداً فرداً جو کچھ لکھتے تھے اسے مشترکہ نام سے چھپواتے تھے۔(۱۲) اردو میں انٹرویوز کی پہلی کتاب کون سی ہے اس کے بارے میں مشفق خواجہ یہ بتاتے ہیں۔ ہمارے تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ انٹرویوز کا سب سے پہلا مجموعہ ندا فاضلی نے ۱۹۷۱ءمیں ''ملاقاتیں'' کے نام سے بمبئی سے شائع کیا تھا۔ یہ وہی ندا فاضلی ہیں جن کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔

؎ سورج کو چونچ میں لیے مرغا کھڑا رہا کھڑکی کے پردے کھینچ دیے رات ہوگئی

اس شعر کے ہیرو کی طرح ندا فاضلی بھی اپنی کتاب ملاقاتیں بازار میں لیے کھڑے رہے۔ مگر گاہکوں نے توجہ نہ کی۔(۱۳)

احمد بشیر معروف صحافی، دانش ور اور ادیب تھے۔ انھوں نے یہ دعویٰ کیا کہ اردو میں انٹرویو اور خاکہ نویسی کی ابتدا ان سے ہوئی۔ مشفق خواجہ نے احمد بشیر کے اس بیان پر گرفت کی، اور بتایا کہ اس کام کی ابتدا احمد بشیر سے پہلے ہی ہو چکی تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اولیت کا شرف کسے حاصل ہے۔ یہاں بھی مشفق خواجہ کا اسلوب فکاہیہ ہے اور انھوں نے یہ معلومات اتنی سادگی اور سہولت سے فراہم کی ہیں کہ قاری کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ کوئی تحقیقی شذرہ پڑھ رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

اس کام کی ابتدا بہت پہلے سے ہو چکی تھی اردو میں پہلا انٹرویو نواب معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم کا تھا جو جولائی ۱۹۳۸ء میں پروفیسر حمید احمد خان نے لیا تھا اور اسی زمانے میں شائع بھی ہوا تھا۔ بگا بیگم غالب کے دوست نواب ضیاء الدین نیر ورخشاں کی بیٹی تھیں اور غالب کے منہ بولے بیٹے مرزا زین العابدین خان عارف کی بہو تھیں اور غالب ہی ان کو عارف کے بیٹے مرزا باقر علی کامل سے بیاہ کر اپنے گھر لائے تھے۔ بگا بیگم نے غالب کا آخری زمانہ دیکھا تھا۔ ان کا انٹرویو غالب ہی کے حوالے سے تھا۔ احمد بشیر اپنے آپ کو اردو میں شخصی خاکہ نگاری کا موجد بھی سمجھتے ہیں۔ فرماتے ہیں ''خاکہ نگاری کی تاریخ پر ایک کتاب میری نظر سے گزری۔ اس کی ابتدا میں نے کی تھی مگر میرا ذکر نہیں آیا اس کتاب میں'' اس قول برحق کو علم کی انتہا سمجھنا چاہیے کہ علم کی انتہا یہی ہے کہ آدمی کو اپنے سوا کچھ نظر نہ آئے۔ احمد بشیر نے بقول خود پہلا خاکہ ۱۹۴۶ء میں لکھا تھا جب کہ اردو کے درجنوں بہترین خاکے ۱۹۴۶ء سے پہلے لکھے جا چکے تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کا مشہور خاکہ ''ڈاکٹر نذیر کی کہانی'' ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا تھا اور تقریباً یہی زمانہ احمد بشیر کی پیدائش کا ہے۔(۱۴) نثری نظم کے بارے میں بہت سے لوگوں کا دعویٰ ہے کہ اس کا

آغاز ان سے ہوا قمر جمیل بھی خود کو نثری نظم کا موجد کہتے ہیں۔ مشفق خواجہ نے یہ ریکارڈ یوں درست کیا۔

۔۔۔۔لیکن استاد لاغر مرادآبادی کو ان ارشادات سے اتفاق نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اردو میں نثری نظم کا رواج موجودہ صدی کی تیسری دہائی میں ہو چکا تھا اور چوتھی دہائی میں کثرت سے نثری نظمیں لکھی گئی ہیں جو اس دور کے ادبی رسالوں میں محفوظ ہیں۔ استادِ گرامی نے اپنے دعوے کے ثبوت میں ''عالم گیر'' اور ''نیرنگ خیال'' جیسے موقر ادبی جریدوں کے کئی شمارے ہمیں دکھائے جن میں حجاب اسماعیل (آج کی حجاب امتیاز علی) اور غلام عباس (افسانہ نگار) جیسے نام ور ادیبوں کے دوش بدوش اس زمانے کے مشہور مگر آج کے غیر معروف بعض ادیبوں کی نثری نظمیں بھی شامل تھیں۔ اس زمانے میں نثری نظم کا شعرِ منثور، اشعارِ منثور، یا منثور نظم کہا جاتا تھا (۱۵)

مشفق خواجہ کے کالموں سے اس دور کی ادبی صورت حال اور خاص طور پر ادبی معرکوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اگر کوئی محقق اس دور کے ادبی معرکوں کو موضوع بنا کر تحقیق کرنا چاہے گا تو وہ ان ادبی کالموں کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ یہ بات بھی دل چسپی کی حامل ہے کہ مشفق خواجہ خود بھی فریقین کو بحث کے لیے مواد فراہم کرتے رہتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ یہ لڑائی بڑھے اور وہ خود اور ان کے قارئین اس سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔ ۸۰ کی دہائی میں محسن بھوپالی اور حمایت علی شاعر کے درمیان نوک جھوک چلتی رہی۔ اس موضوع پر ان کا ایک کالم ہفت روزہ ''تکبیر'' میں ۲۵ رمئی ۱۹۸۴ء کو شائع ہوا۔ اس کالم کا عنوان تھا۔ ''بعض اوقات کتابت کی غلطیوں سے شعر بامعنی ہو جاتے ہیں'' اس کے بعد ۲۳ رنومبر کو مذکورہ شمارے میں ''علامتی افسانے کی طرح اب علامتی تنقید بھی لکھی جارہی ہے'' کے عنوان سے شائع ہونے والے کالم میں بھی اس جھگڑے کی طرف اشارہ ہے اول الذکر کالم بہت دل چسپ ہے۔ اس کالم کے اقتباسات پیشِ خدمت ہیں: حمایت علی شاعر نے محسن بھوپالی پر الزام لگایا تھا کہ ان کے اور سرشار صدیقی کے ایک شعر میں حیرت ناک مماثلت پائی جاتی ہے سرشار کا شعر ہے

ے میں نے اس حال میں اک عمر بسر کی سرشار — ایک ہی دن کبھی اس طرح گزارے کوئی

محسن کا شعر ہے

ے میں نے جس طرح زیست کاٹی ہے — ایک ہی دن سہی بسر تو کر

معلوم نہیں جناب شاؔعر کو ان شعروں کی مماثلت پر حیرت کیوں ہوئی۔ جس طرح سرشار صاحب نے ناگفتہ بہ حالت میں زندگی گزاری کیا اس طرح محسن بھوپالی نہیں گزار سکتے؟۔۔۔۔۔۔جواب آں غزل کے طور پر محسن نے شاعر کی ایک ثلاثی کو سیماب اکبرآبادی کے ایک شعر کی صدائے بازگشت قرار دیا ہے، سیماب کا شعر ہے

ے عقیدت کچھ بنادے، ورنہ پتھر صرف پتھر ہے — حرم کے در میں ہو یا بت کدے کے آستانے میں

شاؔعر کی ثلاثی ہے۔

یہ ایک پتھر جوراستے میں پڑا ہوا ہے
اسے محبت تراش لے تو یہی صنم ہے
اسے عقیدت نواز دے تو یہی خدا ہے

اگر یہ سلسلہ چل نکلا تو حمایت علی شاعر یہ کہہ سکتے ہیں کہ محسن بھوپالی کا یہ شعر

ے زیست ہم سائے سے مانگا ہوا زیور تو نہیں ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے کھو جانے کا

عندلیب شادانی کے اس شعر کی تشکیلِ نو ہے

ے مجبوریوں پر ڈالے ہیں پردے میری ہنسی ہے مانگے کا زیور

ہمارے خیال میں یہ اعتراض نامناسب ہی ہوگا جب کوئی شاعر دوسروں سے زیور مانگ سکتا ہے تو شعر کا مضمون کیوں نہیں مانگ سکتا۔ (۱۶) اسی معرکے پر ایک اور کالم میں لکھتے ہیں :

جی تو چاہتا ہے کہ ''شخص و عکس'' کے کچھ مزے دار اقتباس پیش کر کے بتایا جائے کہ جناب شاعر نے کہیں تاریخی شواہد سے، کہیں طنز و مزاح سے کام لے کر اور کہیں عدالتی کارروائی کی دھمکی دے کر حریفوں کو اپنی حرکتوں سے باز آنے کا مشورہ دیا ہے ۔لیکن افسوس کہ ہمارے کالم میں اقتباسات کی گنجائش نہیں نکل سکتی ۔ بہر حال جن حضرات کو ادبی معرکہ آرائیوں سے دل چسپی ہو،انھیں اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے خصوصاً جناب محسن بھوپالی کو، کیوں کہ ان کا دعویٰ ہے کہ حمایت علی شاعر کے ''ادبی سرقوں'' کا سب سے پہلے سراغ انھوں نے ہی لگایا تھا ۔ہمیں یقین ہے کہ محسن اس کتاب کو دیکھتے ہی کہیں گے ''اس کا نام ہی مالِ مسروقہ ہے عنوان چشتی کی کتاب ''شخص و عکس'' کے نام سے کئی۔سال پہلے شائع ہو چکی ہے (۱۷)

مندرجہ بالا اقتباس سے نا صرف یہ کہ ادبی معرکے کے بارے میں معلومات ملتی ہیں بلکہ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ حمایت علی شاعر سے پہلے عنوان چشتی اسی نام سے ایک کتاب لکھ چکے تھے۔اس ضمن میں ۱۸ر نومبر ۱۹۸۳ء کو ''جسارت'' میں ''افتخار عارف سے پہلے غالب پر بھی سرقہ کا الزام لگ چکا ہے'' کے عنوان سے شائع ہونے والے کالم کا مطالعہ بھی دل چسپی کا حامل ہے۔شاہد عبداللہ نامی کسی شخص نے مشفق خواجہ کو خط لکھا اور افتخار عارف کے مجموعۂ کلام ''مہرِ دونیم'' میں شامل کچھ اشعار کے بارے میں کہا کہ یہ ''چوری'' کے ہیں۔مشفق خواجہ اس پر لکھتے ہیں۔

حیرت ہے کہ شاہد عبداللہ کو ''مہر دونیم'' میں صرف گنتی کے چند شعر ملے جو دوسروں کا مال ہیں اگر موصوف مراسلہ لکھنے سے پہلے ہم سے مشورہ کر لیتے تو ''مہر دونیم'' کی معنویت کو واضح کرتے ہوئے افتخار عارف کے آدھے کلام کو سحر انصاری اور پروین شاکر وغیرہ کی تصنیف ثابت کر سکتے تھے۔یہی نہیں بلکہ یہ بھی ثابت کر سکتے تھے کہ پروین شاکر اور سحر انصاری نے بھی دوسروں کے چراغ سے اپنے چراغ جلائے ہیں،اپنی اس بات کو واضح کرنے کے لیے ہم صرف دو مثالیں پیش کریں گے کہا گیا ہے کہ افتخار عارف کا شعر

؎ کیا زیست کریں کہ اب تو صاحب   مرنے کا بھی حوصلہ نہیں ہے

پروین شاکر کے اس شعر کا چربہ ہے۔

؎ جینے کی آرزو کب تھی   مرنے کا بھی حوصلہ نہیں ہے

لیکن جاں نثار اختر کے والد مضطر خیر آبادی کا یہ شعر دونوں شاعروں کی پیدائش سے پہلے کا ہے۔

؎ ہم زندہ ہیں لیکن اس طرح سے   مرنے کا بھی حوصلہ نہیں ہے

افتخار عارف کا شعر ہے۔

؎ کریں تو کس سے کریں نارسائیوں کا گلہ   سفر تمام ہوا ہم سفر نہیں آیا

اس شعر کو سحر انصاری کے مندرجہ ذیل شعر کی بازگشت کہا گیا ہے۔

؎ کہوں تو کس سے کہوں آ کے اب سرِ منزل   سفر تمام ہوا ہم سفر نہیں آیا

ان دونوں شعروں سے بہت پہلے پرویز شاہدی نے یہ شعر کہا تھا۔

؎ بچھڑ گئے سرِ منزل ہم اپنے آپ سے جب   سفر تمام ہوا ہم سفر نہیں آیا

ان مثالوں سے واضح ہوجاتا ہے کہ صرف افتخار عارف پر سرقے کا الزام نہیں لگایا جاسکتا باقی دو شاعر بھی اس جرم میں برابر کے شریک ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ یہاں سرقہ انفرادی فعل نہیں اجتماعی کاوش ہے۔ افتخار عارف پروین شاکر اور سحر انصاری نے ایک دوسرے سے نہیں مشترکہ ماخذ سے استفادہ کیا ہے(۱۸)

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مشفق خواجہ بے پناہ معلومات کے حامل تھے۔ جدید اور کلاسیکی ادب پر ان کی گہری نظر تھی اور اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ معلومات پیش کرنے کا سلیقہ بھی رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے ادبی کالموں سے بہت سی ادبی شخصیات کے سوانحی حالات معلوم ہوجاتے ہیں نیز ان شخصیات کی نگارشات پر مختصر اور مفید تنقیدی نوٹ بھی دلچسپی کے حامل ہیں۔ جوش ملیح آبادی، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر سلیم اختر، انور سدید، افتخار عارف، عطاء الحق قاسمی، امجد اسلام امجد، انیس ناگی، حمایت علی شاعر، محسن بھوپالی، احمد بشیر، ساقی فاروقی، خلیق انجم، مظفر علی سید، نظیر صدیقی، استاد اختر انصاری اکبر آبادی وہ شخصیات ہیں کہ جن کے بارے میں تحقیق کرنے والوں کو ان کالموں سے بہت مدد مل سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اصناف نظم و نثر کے بارے میں بہت سی تاریخی معلومات ان کالموں میں موجود ہیں۔ ان کالموں میں پائے جانے والے تنقیدی نوٹ بہت سہل اور عام فہم ہیں۔ مشفق خواجہ تخلیقی اور تاریخی معلومات اتنی سہولت اور سلیقے سے فراہم کرتے تھے کہ یہ کسی کو بھی بآسانی ہضم ہوسکتی تھیں ان کے کالم طنز، مزاح، تنقید اور تحقیق کا نہایت حسین امتزاج تھے۔ ان کالموں کے بارے میں عطاالحق قاسمی کا کہنا ہے کہ :

”ان کی شوخیٔ تحریر کا کمال یہ تھا کہ ان کا طنز و مزاح بے پایاں علم میں رچا بسا ہوتا تھا۔

علومات کا ایک ذخیرہ تھا جوان کے فکاہی کالم میں نظر آتا تھا مگر اچھے ''باورچی'' کی طرح وہ اپنا ادبی پکوان اس مہارت سے تیار کرتے تے کہ مرچ مصالحہ تیر تا نظر نہیں آتا تھا بلکہ وہ پکوان کا حصہ بن کراس کی لذت میں اضافہ کرتا تھا۔علم اور طنز ومزاح کا یہ سنگم ہمارے ہاں کم کم ہی نظر آتا ہے۔''(۱۹)

حوالہ جات

۱۔ عبدالرحمٰن طارق، ''دنیائے ادب کا مشفق اور میرے حیٔ بھائی جان''مشمولہ: ماہ نامہ ''قومی زبان'' کراچی۔جلد:۷۸، شمارہ-۲،فروری ۲۰۰۶ء

۲۔ شاہ نواز فاروقی، ''اکابر صحافت'' مقالہ برائے ایم۔اے صحافت، کراچی یونی ورسٹی، ۱۹۹۱ء، ص ۲۰۶

۳۔ ایضاً ۴۔ ایضاً، ص ۲۱۰ ۵۔ ایضاً

۶۔ عبدالرحمٰن طارق، ''دنیائے ادب کا مشفق اور میرے حیٔ بھائی جان''مشمولہ ماہ نامہ ''قومی زبان'' کراچی، فروری ۲۰۰۶ء

۷۔ ڈاکٹر خلیق انجم، بحوالہ ڈاکٹر انور سدید، ''سن تو سہی'' مرتبین ڈاکٹر انور سدید، خواجہ عبدالرحمٰن طارق، اسلام آباد، پورب اکیڈمی، طبع اول مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۲۴

۸۔ خواجہ محمد ذکریا، انٹرویو، از راقم الحروف، بمقام: پنجاب یونی ورسٹی نیو کیمپس، ۳/ اکتوبر ۲۰۱۱ء

۹۔ ڈاکٹر سلیم اختر، ''مشفق خواجہ'' ماہ نامہ ''اخبار اردو'' اسلام آباد، جلد ۲۱، شمارہ -۹، ستمبر ۲۰۰۵ء

۱۰۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان، ''مشفق خواجہ منفرد کلچر کا نمائندہ'' ماہ نامہ ''قومی زبان'' فروری ۲۰۰۶ء

۱۱۔ مشفق خواجہ، ''خامہ بگوش کے قلم سے'' مرتب: مظفر علی سید، لاہور، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی طبع دوم، ۲۰۰۷ء، ص ۲۰۷

۱۲۔ مشفق خواجہ، ''ادب کے سلامت علی، نزاکت علی'' ہفت روزہ ''تکبیر'' کراچی، جلد: ۱۷، شمارہ-۳۱: ، اگست ۱۹۹۵ء

۱۳۔ مشفق خواجہ ''خامہ بگوشیاں'' مرتبین ڈاکٹر انور سدید، خواجہ عبدالرحمٰن طارق، اسلام آباد، پورب اکیڈمی، طبع اول، ۲۰۱۰ء، ص ۳۸

۱۴۔ مشفق خواجہ ''سخن ہائے نہ گفتنی'' مرتب: مظفر علی سید، کراچی، اکادمی بازیافت، ۲۰۰۴ء، ص ۴۳، ۴۴

۱۵۔ ایضاً ص ۴۸، ۴۹

۱۶۔ مشفق خواجہ، ''بعض اوقات کتابت کی غلطیوں سے شعر بامعنی ہو جاتے ہیں'' ہفت روزہ ''تکبیر'' کراچی، جلد ۶، شمارہ : ۲۲، ۲۵ مئی ۱۹۸۴ء

۱۷۔ مشفق خواجہ، ''علامتی افسانے کی طرح اب علامتی تنقید بھی لکھی جا رہی ہے'' ہفت روزہ ''تکبیر'' کراچی، جلد: ۶، شمارہ: ۴۸، نومبر ۱۹۸۴ء

۱۸۔ مشفق خواجہ ''افتخار عارف سے پہلے غالب پر بھی سرقہ کا الزام لگ چکا ہے'' روزنامہ ''جسارت'' کراچی، ۱۸ نومبر ۱۹۸۳ء

۱۹۔ عطاء الحق قاسمی، ''ایسا کہاں سے لاؤں'' روزنامہ ''جنگ'' لاہور، ۲۵ فروری ۲۰۰۵ء